

تتزیل و تاویل

امثال القرآن

(۶)

از جناب مولوی محمد ایوب صاحب جیرا چپوری

(۲۰) اہل کفر کے انفاق مال کی مثال:
 اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا لَنْ نُّغْنِيَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ
 وَلَا اَوْلَادُهُمْ مِنَ اللّٰهِ شَيْئًا وَاُولٰٓئِكَ
 اَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خَالِدُوْنَ مَثَلُ
 مَا يَنْفِقُوْنَ فِيْ هٰذَا الدُّنْيَا كَمَثَلِ رِيْحٍ
 فِيْهَا صِرٌّ اَصَابَتْ حَرْثَ قَوْمٍ ظَلَمُوْا
 اَنْفُسَهُمْ فَاَهْلَكَتْهُ وَمَا ظَلَمُوْا
 اللّٰهَ وَاَلٰٓئِكَ اَنْفُسُهُمْ
 يَظْلِمُوْنَ -

(ال عمران - ۱۳)

جن لوگوں نے کفر کیا ہے ان کو اللہ کی رحمت سے
 محروم ہو کر نہ تو ان کا مال کچھ کام دینگا اور نہ ان کی اولاد
 وہ آگ میں جہنم والے لوگ ہیں جس میں وہ ہمیشہ
 جو کچھ یہ لوگ اس دنیا میں خرچ کرتے ہیں اسکی مثال اس
 ہوا کی سی ہے جس میں سخت ٹھنڈک ہو اور وہ لگ لگائی
 کی کھیتی کو جاگے جو دنیا فانی خدا کے باعث، لپٹاؤ پر ظلم
 کر رہے تھے، اور اس کھیتی کو دھلا کر، تباہ کر دے۔ اللہ
 نے ان پر کچھ بھی ظلم نہیں کیا بلکہ وہ خود اپنے اوپر آپ ظلم کر رہے
 تھے (جس کا توجہ اس شکل میں ظاہر ہوا)

اس تمثیل میں بتلایا گیا ہے کہ اس شخص کا انجام کیا ہو گا جو اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے بجائے
 اپنی خواہشات نفس کی تسکین کے لیے یا شہرت و ناموری کی خاطر، یا حتیٰ کی مخالفت اور راہ راست دنیا کو

روکنے کے لیے اپنا مال خرچ کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ایسے خرچ کی مثال اس کھیتی کی سی ہے جس سے کسان بڑی بڑی امیدیں لگائے بیٹھا ہو اور یکایک سرد ہوا کا جھونکا آئے اور اس کی تیز اور حد سے بڑھی ہوئی برودت ساری کھیتی کو جلا کر تباہ و برباد کر ڈالے اور پہلے ہوتے ہوئے سبزہ کی جگہ سوکھے ہوئے پودے چھوڑ جائے۔

لفظ ”حص“ کے معنی میں ارباب تاویل کا اختلاف ہے۔ ایک قول تو وہ ہے جسے ہم نے اوپر اختیار کیا ہے یعنی برودت شدید۔

حضرت ابن عباسؓ کا خیال ہے کہ حص کے معنی ”نار“ (یعنی آگ) کے ہیں۔ تیسرا قول یہ ہے کہ ”حص“ اس آواز کو کہتے ہیں جو ہوا کے تیز دندنہ جھونکوں سے پیدا ہوتی ہے۔ لیکن ان تینوں اقوال میں کوئی خاص منافات نہیں بلکہ تینوں باہم متلازم ہیں۔ کیونکہ ”حص“ ہوا کی اسی سخت برودت کو کہتے ہیں جسکی بیوست (خشکی) نباتات کو اسی طرح جلا دیتی ہے جس طرح آگ۔ اور اس کے ساتھ ہی اس میں تیز آواز یعنی سرسراہٹ بھی ہوتی ہے۔

”و ظلوا انفسہم“ کی قید میں ایک خاص نکتہ ہے جو اس حقیقت کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ کھیتی کے جل کر تہس نہس ہو جانے کی علت خود ان لوگوں کا ظلم اور راست سے تجاوز تھا ورنہ یہ بات قانون قدرت کے خلاف ہے کہ وہ کسی پر ایک شمع بھی زیادتی کرے۔ دراصل ان کے اس فعل نے پائے کو دعوت دی کہ وہ آئے اور خدا نے جو نعمت انھیں دے رکھی ہے اسے تاراج کر دے۔ پس ان کا یہ ظلم ہی وہ ہوا ہے جو ان کے اعمال اور نفقات کو ہلاک و برباد کرتی رہتی ہے یہاں تک کہ جس کشت عمل کی شادابیوں کا وہ یقین کیے بیٹھے ہیں، قیامت کے دن دیکھیں گے کہ ان کے ”ظلم“ کی تیز اور سرد ہونے سے جلا کر بے کار بنا رکھا ہے۔

(۲۱) کلہ یبئہ (علم حق) اور کلہ خبیثہ (علم باطل) کی مثال:

الْمَرَّ كَيْفَ ضَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا
كَلِمَةً طَيِّبَةً لَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ أَصْلُهَا
ثَابِتٌ وَفَرْعُهَا فِي السَّمَاءِ تُؤْتِي
أُكْلَهَا كُلَّ حِينٍ يُبَادِنُ رَبِّهَا
وَيَضْرِبُ اللَّهُ الْأَمْثَالَ لِلنَّاسِ
لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ ه
وَمَثَلُ كَلِمَةٍ خَبِيثَةٍ كَشَجَرَةٍ
خَبِيثَةٍ اجْتُثَّتْ مِنْ فَوْقِ الْأَرْضِ
مَا لَهَا مِنْ قَرَارٍ -

کیا تم نے اس بات پر دھیان نہیں کیا کہ اللہ تعالیٰ
نے (کلمہ طیبہ کی) کیسی مثال دی ہے۔ ”کلمہ طیبہ“ ایک
اچھی ذات و درخت کی طرح ہے جس کی جڑ مضبوط و زمین
کے اندر جمی ہوئی ہے اور جسکی شاخیں آسمان میں ہیں
اور جو اپنے پروردگار کے حکم سے ہر وقت پھل لاتا رہتا ہے
اور اللہ تعالیٰ لوگوں کے سامنے یہ مثالیں اس لیے بیان
کرتا ہے کہ وہ (حقائق کا) احساس کریں۔

اور ”کلمہ خبیثہ“ کی مثال اس (ناکارہ اور) بد عمل
درخت کی سی ہے جو (بآسانی) زمین کے اوپر سے اٹھ جائے
(اور) اسے کوئی جھاؤ اور مضبوطی حاصل نہ ہو۔

(ابراہیم - ۲)

یہ دو متقابل مثالیں ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے حق و باطل کے فطری جوہروں کو مشاہد کرنے کے لیے
بیان فرمایا ہے۔ ہم ان دونوں مثالوں کی الگ الگ تشریح کریں گے۔

پہلی مثال میں اللہ تعالیٰ کہتا ہے کہ ”کلمہ طیبہ“ ایک عمدہ درخت کا مانند ہے۔ وجہ مشابہت بالکل
عیساں ہے۔ کلمہ طیبہ سے اعمال صالحہ کے پھل نکلتے ہیں جس طرح کہ عمدہ درخت سے کارآمد اور عمدہ پھل پیدا
ہوتے ہیں۔ جبہو مفسرین کے اقوال سے یہی تاویل مفہوم ہوتی ہے جن کا خیال ہے کہ کلمہ طیبہ سے مراد کلمہ شہادت
لا الہ الا اللہ ہے، کیونکہ یہی کلمہ تمام ظاہری اور باطنی اعمال صالحہ کا سرچشمہ ہے، اور ہر نیک عمل
اسی کلمہ کا ثمرہ۔

علی ابن ابی طلحہ نے اپنی تفسیر میں ابن عباس کا قول نقل کیا ہے کہ کلمہ طیبہ شہادت توحید ہے
اور شجرہ طیبہ، ذات مومن۔ ”اصلہا ثابت“ کا مطلب یہ ہے کہ قول لا الہ الا اللہ

مومن کے قلب میں جڑ پکڑے ہوئے ہے اور ”فرعہا فی السماء“ کنایہ ہے اس امر کی طرف کہ یہی کلمہ شہادت مومن کے اعمال کو عرشِ الہی تک پہنچاتا ہے۔

ربیع بن انس فرماتے ہیں کہ کلمہ طیبہ سے مراد ایمان ہے۔ یہاں ایمان ہی کو شجرہ طیبہ سے تشبیہ دی گئی ہے، اور اصل ثابت سے مقصودِ اخلاص ہے۔ اور ایمان و اخلاص سے جو خوفِ خدا پیدا ہوتا ہے اس کو آسمان کی بلندیوں تک پہنچنے والی شاخ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

اگرچہ کلمہ طیبہ کی تاویل ان دونوں اقوال میں ایک ہی ہے لیکن ہمارے خیال میں پوری تمثیل کی یہ آخری توضیح زیادہ صحیح ہے۔ اس تشریح سے تشبیہ میں کھلی ہوئی مطابقت پیدا ہو جاتی ہے اور اس کا حسن بالکل نکھر کر سامنے آ جاتا ہے۔ مشبہہ شجر توحید ہے جو مومن کے دل میں اگ رہا ہے اور مشبہ بہ وہ عمدہ اور پاکیزہ درخت ہے جسکی جڑ نہایت مضبوط ہو، جسکی شاخیں آسمان سے باتیں کرنے والی ہوں اور جو برابر پھل دے جا رہا ہو۔ غور کرو گے تو معلوم ہو گا کہ یہ تمام صفات ”شجر توحید“ میں کس طرح پائی جاتی ہیں۔ اس کی جڑیں قلبِ مومن کے ریشہ ریشہ میں پیوست ہوتی ہیں۔ اسکی شاخہائے اعمال صالحہ آسمانوں تک جا پہنچتی ہیں۔ اور وہ ہر آن، ہر لحظہ نیکیوں کے اتنے ہی زیادہ پھل لاتا رہتا ہے جتنا زیادہ اس کی جڑوں میں ثبات ہوتا ہے۔ یعنی جتنا ہی زیادہ اس (شہادت توحید) میں اخلاص اور اذعان ہوتا ہے اور جتنا زیادہ قلب کو اس کے جمال سے عشق، اس کے حقائق کی معرفت اور اس کے مقتضیات کی برآری کا لحاظ رہتا ہے اتنے ہی زیادہ اس سے نیک اعمال صادر ہوتے ہیں۔

پس جس شخص کے قلب میں یہ کلمہ طیبہ اپنی کامل حقیقت کے ساتھ جم گیا اور جس کا باطن اس کے لاہوتی رنگ میں پوری طرح رنگ گیا، یقین کرو کہ وہی اُس ماہیتِ الوہیت کا حقیقی راز دان ہے جس کا نشیمن یہی قلبِ مومن ہوا کرتا ہے۔ پھر صرف اسکی زبان واحدانیت کی گواہی دیتی ہے بلکہ اس کے سارے جوارح سے توحید کی شہادت تراوش کرنے لگتی ہے۔ اس کے بعد وہ اس ماہیت (یعنی مقامِ الوہیت)

اور اس کے تمام لوازم کی خدا کے سوا ہر دوسری چیز سے نفی کر دیتا ہے اور ساری مخلوق کو اپنا ہی جیسا بیچ اور مجبور محض سمجھنے لگتا ہے۔ اس وقت دنیا اپنی نگاہوں سے صاف طور پر دیکھتی ہے کہ یہ کلمہ طیبہ جو اس کے دل پر نقش ہے اور جس کا اس کی زبان سے ہر وقت اعلان ہوتا رہتا ہے، کس طرح دم بدم نیکوں کے حیات آفریں پھل دیتا رہتا ہے، ایسی نیکیاں جو برابر اللہ کے حضور میں پہنچتی رہتی ہیں۔ گویا ہی کلمہ طیبہ ان اعمال کو بارگاہ الہی میں پہنچانے کا ذریعہ ہے پھر یہی کلمہ بہت دوسرے کلمات طیبہ پیدا کرتا ہے جن کے ساتھ مزید نیک اعمال ظہور میں آتے ہیں۔ اور یہ نیک اعمال ان کلمات طیبہ کو اٹھا کر حضور الہی تک لے جاتے ہیں۔ جیسا کہ ذیل کی آیت میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

إِنَّهُ يَصْعَدُ الْكَلِمَ الطَّيِّبَ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهُ - (فاطر - ۲)

اللہ ہی کی طرف کلمہ طیبہ (یعنی اچھی بات) پہنچتا ہے
عمل صالح اسے اٹھاتا اور بلند کرتا ہے۔

یہاں اللہ تعالیٰ نے واضح طور پر بتلادیا ہے کہ عمل صالح ہی کلمہ طیبہ کو عرش تک پہنچاتا ہے۔ اور مثال زیر بحث میں اتنی بات اور فرمادی ہے کہ یہی کلمہ مومن سے اچھے اعمال کرتا ہے۔ اب ان آیتوں کو ایک ساتھ ملا کر پڑھو۔ مقصود الہی بالکل روشن ہو جاتا ہے۔ جب کوئی شخص کلمہ توحید کی اہل اسپرٹ کو سمجھ جاتا ہے اور اس سمجھ جانے کا اثر اس کی عملی زندگی میں نمایاں ہو جاتا ہے تو بس یوں سمجھو کہ یہ کلمہ ایک ایسے درخت کی طرح ہے جس کی جڑ اس کے قلب میں مضبوطی کے ساتھ جمی ہوئی ہے اور اس کی شاخیں آسمانی کناروں تک جا پہنچی ہیں اور وہ درخت برابر پھلتا رہتا ہے۔

”شجرہ طیبہ“ کی تاویل میں سلف کے مختلف اقوال مذکور ہیں۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ شجرہ طیبہ سے مراد کعبہ اور کعبہ کا درخت ہے۔ اور حضرت ابن عمر کی روایت سے اسی قول کی تائید ہوتی ہے۔

ایک جماعت کا خیال ہے کہ شجرہ طیبہ خود ذات مومن ہے۔ حضرت ابن عباس اور عطیہ العونی

وغیرہ اکابر کی یہی رائے ہے۔

لیکن دراصل ان دونوں قولوں میں اختلاف نہیں۔ نفس تشبیہ پر اس سے کوئی اثر نہیں پڑتا۔ کیونکہ برکات کے لحاظ سے مومن اور کھجور کے درخت کو ایک دوسرے سے تشبیہ دیتے ہیں۔ اگر کھجور کا درخت شجرہ طیبہ ہو سکتا ہے تو مومن کا وجود بدرجہ اولیٰ ہو سکتا ہے۔ اس لیے مشبہ بہ خواہ اسے قرار دو خواہ اسے مقصود تشبیہ میں کوئی فرق نہیں پڑ سکتا۔

ایک اور تیسرا قول یہ بھی ہے کہ یہ شجرہ طیبہ جب کا ذکر مثال زیر بحث میں ہوا ہے، جنت کا ایک درخت ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تب بھی کوئی مضائقہ نہیں۔ تشبیہ کا مقصد اس سے بھی پورا ہو جاتا ہے۔ اس مثال کے اندر اسرار و معارف کا جو بیش بہا خزانہ پوشیدہ ہے وہ بس اسی مرکز علم و حکمت ہی کا حصہ ہے جس نے اسے بیان فرمایا ہے۔ آؤ اس کے بعض محاسن کو سمجھنے کی کوشش کریں۔

درخت میں چار چیزوں کا وجود ضروری ہے۔ جڑ، تنہ، شاخیں اور پھل۔ شجر ایمان کے اندر بھی ان چاروں چیزوں کا وجود ہونا چاہیے تاکہ مشبہ اور مشبہ بہ میں کامل مطابقت ظاہر ہو سکے۔ سو علم و معرفت اور اذعان قلب شجر ایمان کی جڑ ہے۔ اخلاص اس کا تنہ ہے، اعمال اس کی شاخیں ہیں اور پھل وہ اخلاق حسنہ اور وہ صفات حمیدہ ہیں جو ان اعمال صالحہ کے کرنے سے لازمی طور پر فطرت انسانی میں پیدا ہو جاتے ہیں۔ انہیں تمام اشیاء کا لحاظ کر کے فیصلہ کیا جاسکتا ہے کہ کس دل میں ایمان ہے اور کس میں نہیں۔ اگر کسی کے اندر یہ تمام چیزیں موجود پائی جائیں، یعنی اگر اس کا علم عالم الغیب کی نازل کردہ کتابوں کے مطابق ہے، اگر اس کا اعتقاد اس معیار پر صحیح اترتا ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں کی زبانی بیان فرمایا ہے، اگر اخلاص کا نور اس کے دل میں موجود ہے اور اعمال ان اشیاء مذکورہ کے اقتضائے موافق صادر ہو رہے ہیں تو سمجھنا چاہیے کہ ایمان کا شجر مبارک اس کے قلب میں اگا ہوا اور تروتازہ ہے، جسکی جڑیں مضبوط اور جسکی ٹہنیاں آسمان تک پھیلی ہوئی ہیں۔ اور اگر معاملہ برعکس ہو تو یقین کر لینا چاہیے کہ اس قلب کی سطح پر جو درخت لگا ہوا ہے وہ ایک

ناکارہ اور بے جان درخت ہے جسکی جڑوں میں کوئی دم نہیں اور جو ایک جھٹکے میں اکھڑ جانے والا ہے۔

پھر یہ دیکھو کہ کوئی درخت اس وقت تک زندہ نہیں رہ سکتا جب تک کہ اس کی آبیاری نہ ہوتی رہے۔ پانی دینا چھوڑ دو کچھ دنوں میں خشک ہو جائیگا۔ شجر اسلام کا بھی یہی حال ہے۔ انسان اس کی باقاعدہ دیکھ بھال نہ رکھے اور برابر تدبیر و تفکر اور علم نافع اور عمل صالح سے اس کی آبیاری نہ کرتا رہے تو اس کی شادابی حیات آج نہیں تو کل فرور ختم ہو جائیگی۔ چنانچہ مسند امام احمد بن حنبل میں حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلعم نے فرمایا:

”وایمان کپڑے کی طرح پرانا ہو جایا کرتا ہے لہذا اپنے ایمانوں کو نیا دتازہ کرتے رہو“

یہیں سے یہ نکتہ بھی سمجھ میں آجاتا ہے کہ انسان کی حیات ایمانی کے لیے ان موقت اور پیہم عبادات کی کیسی شدید ضرورت ہے جنہیں اللہ تعالیٰ نے فرض کیا ہے اور اللہ تعالیٰ کا یہ کتنا بڑا ہم پر احسان ہے کہ اس نے اُس شجر توحید کو تروتازہ رکھنے کا سامان ہم پہنچا دیا ہے جسکی کاشت اس نے ہمارے قلوب میں کر رکھی ہے۔

اچھے باغ یا عمدہ زراعت حاصل کرنے کے لیے قدرت کا یہ مقررہ قانون ہے کہ اسے بیگانے

پودوں سے پاک صاف ہونا چاہیے۔ اگر مالی اپنے باغ کو یا کسان اپنی کھیتی کو ایسے پودوں اور ایسی گھاسوں سے محفوظ رکھتا ہے اور انہیں کھود کھود کر پھینکتا رہتا ہے تو اس کا باغ پوری طاقت کے ساتھ بڑھے اور پھیلے گا۔ اس کے پودوں کو کامل روئیدگی حاصل ہوگی۔ اس میں نہایت کثرت سے عمدہ اور پاکیزہ پھل آئینگے۔ لیکن اگر وہ ایسا کرنا چھوڑ دے تو خود رو پودے اور بیگانہ جھاڑ جھنکار سارے باغ میں پھیل جائیں گے، زمین کی قوت نمو کو جذب کرتے جائیں گے اور کسان کا اصل مقصود یعنی پاکیزہ پھل لانے والے درخت غذا کی کمی کی وجہ سے بے جان اور پڑ مردہ ہو کر رہ جائیں گے۔ ان میں اول تو پھل آئیں گے

ہی نہیں اور اگر تھوڑے بہت آئے بھی تو ناقص اور ناکارہ ہونگے۔ چنانچہ جو کم فہم اور ناتجربہ کار باغبان اس بات کو نہیں سمجھتا وہ بڑے گھاٹے میں رہتا ہے اور نہیں جانتا کہ ایسا کیوں ہوتا ہے۔

پس مومن کو ہمیشہ دو باتوں کی سعی کرنی چاہیے۔ ایک تو یہ کہ اس شجر ایمانی کو برابر پانی دیتا رہے۔ دوسری یہ کہ اس کے ماحول کو اشجارِ خبیثہ سے پاک صاف رکھے۔ پانی دینے ہی میں اس کی بقا اور دوام اور دیکھ بھال ہی اس کے کمال نشو و ارتقا کی ضامن ہے۔

یہ ان اسرارِ وحکم کے بعض پہلو ہیں جو اس پُر معنی تمثیل کی تہوں میں چھپے ہوئے ہیں اور غالباً اُس سمندر کے مقابلہ میں ایک قطرہ ہی کی حیثیت رکھتے ہیں جو اس کی گہرائیوں میں مستور ہے، اور یہ ہمارے اذہان کی نارسائی، ہمارے قلوب کی بے نوری، ہمارے علوم کی کوتاہی اور ہمارے اعمال کی بے برکتی کا تقصُّوب ہے کہ ہم اس سے زیادہ اپنے ظرف میں نہیں لے سکتے۔ ورنہ اگر ہمارے دل میں روشنی، ہماری روحوں میں پاکیزگی، ہمارے ذہنوں میں جلا اور ہمارے اعمال میں خلوص ہو اور ہم اللہ اور اس کے رسول سے حقیقت کے انوار اخذ کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں تو یقیناً کلامِ الہی کے وہ اسرار و معارف ہم پر منکشف ہو جائیں جنکی تابانیوں کے سامنے یہ سارے رسمی علوم اور یہ ساری دنیوی قال و قول ماند پڑ جائے۔ یہی وہ نعمت ہے جو صحابہ کرام کو نصیب ہوئی اور دوسرے اس سے محروم ہیں اور اسی صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے علم و عرفان کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ واللہ یختص بہ رحمۃ من یشاء۔

دوسری مثال میں دراصل پہلی ہی مثال کا مقابل پہلو واضح کیا گیا ہے کہ دو کلمہ طیبہ کے مقابلہ میں دو کلمہ خبیثہ کی کیا ماہیت ہے۔ اللہ تعالیٰ کہتا ہے کہ یہ کلمہ اس شجرِ خبیثہ کے مشابہ ہے جو معمولی جھکے میں اکھڑ جانے والا ہو۔ جس میں نہ کوئی مضبوط جڑ ہو، نہ بلند و بالا شاخیں ہوں، نہ اچھے پھل ہوں، نہ سایہ ہو، نہ بستر ہو، غرضیکہ سر سے پاؤں تک اس کے اندر کوئی حسن و خوبی اور کوئی خیر و منفعت نہ ہو۔ دو کلمہ خبیثہ سے کیا مراد ہے؟ اس کے متعلق سلف سے چند اقوال مذکور ہیں۔ صحاح فرماتے

ہیں کہ کلمہ خبیثہ کافر کو کہا گیا ہے اور آیت کا مفہوم یہ ہے کہ اس درخت کی طرح، جس کی صفات اور ماہیت کا اوپر ذکر ہوا، کافر کے اعمال خیر کی روح سے خالی ہوتے ہیں، ان میں کوئی ثبات اور وزن نہیں ہوتا اور نہ اللہ تعالیٰ ان میں کوئی برکت اور منفعت عطا فرماتا ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ کے نزدیک کلمہ خبیثہ سے مراد شرک ہے اور شجرہ خبیثہ سے مراد کافر ہے یعنی مشبہ شرک اور مشبہ بہ کافر کی ذات ہے۔ آیت کا مرعا یہ ہے کہ شرک کی کوئی بنیاد نہیں ہوتی جس پر شرک اعتماد کر سکے۔ وہ اپنی صداقت پر کوئی دلیل نہیں رکھتا۔ اللہ تعالیٰ کوئی مشرک کا نہ عمل قبول نہیں کرتا اور نہ اسے اللہ کے حضور میں سامیٰ ہوتی ہے۔ اسی حقیقت کو یوں بیان فرمایا ہے کہ ”وہ تو اس شجر خبیث میں کوئی مضبوط جڑ ہے جو زمین میں جھی ہو، نہ ہی اوپر کی طرف شاخیں ہیں“ یعنی مشرک کے جیب و دامن میں کوئی نیکی نہیں ہوتی جسے دنیا یا آخرت میں کوئی وزن حاصل ہو۔

ایک صاحب علم سے پوچھا گیا کہ کلمہ خبیثہ کی حقیقت کیا ہے؟ فرمایا نہ تو اس کے لیے زمین میں کوئی جائے قرار ہے نہ آسمان میں کوئی محل صعود، بلکہ وہ اپنے قائل اور متبع کی گردن میں لٹکا رہتا ہے اور اس وقت تک لٹکا رہے گا جب تک کہ قیامت نہ آجائے۔

ان دونوں مثلوں کے بیان کرنے اور کلمہ طیبہ اور کلمہ خبیثہ کی حقیقتیں عریاں کر دینے کے بعد اللہ تعالیٰ ان دونوں کے آثار و نتائج پر روشنی ڈالتا ہے، اور اپنی صفت عدل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ:

يُنَبِّئُ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا بِالْقَوْلِ
الثَّابِتِ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَفِي الْآخِرَةِ
وَيُضِلُّ اللَّهُ الظَّالِمِينَ وَيَفْعَلُ اللَّهُ
مَا يَشَاءُ - (ابراہیم - ۲۷)

جو لوگ ایمان لائے ہیں انہیں اللہ تعالیٰ یکتا بات
یعنی کلمہ طیبہ کے ذریعہ دنیا کی زندگی میں بھی اور آخرت
میں بھی دو ثبات دے گا اور ظالمین کو۔ اور اللہ ظالموں کو
آوارہ و بے راہ بنا دیتا ہے اور اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔

اس آیت میں انسانی فلاح کا حقیقی راز کھول دیا گیا ہے۔ خدا کی اسی نوازش پر جسے اس نے ثبات اور جاؤ اور قرار بخشنے سے تعبیر کیا ہے، انسان کی کامرانی یا محرومی کا دار و مدار ہے۔ کوئی شخص ایک لمحہ کے لیے بھی اس نوازش سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ اگر خدا کسی کو اپنی اس ثبات بخشی کی نعمت سے محروم کر دے تو دیکھتے دیکھتے اس کے ایمان کی اور اسکی زندگی کی بنیادیں ہل جائیں۔ عام انسان تو ایک طرف رہے خود تمام انسانوں کے سردار اور دنیا کے سب سے بڑے صاحب ایمان بندہ دروہی (فداہ) کے بارے میں خدا کہتا ہے کہ:

لَوْ لَا اَنْ تَبْتُنَاكَ لَقَدْ كِدْتَّ
تَوَكَّنْ اِلَيْهِمْ شَيْئًا قَلِيلًا (نبی سرائی)

اگر ہم تمہیں ثبات نہ بخشتے تو تم ان مشرکوں کی
طرف کچھ (نہ کچھ) فرود جھک پڑے ہوتے۔

دوسری جگہ ہے:

وَكَأَن نَّقْصُ عَلَيْكَ مِنْ
اَنْبَاءِ السُّلِّ مَا نُنَبِّئُ
بِهِ فَوَاذَكَ - (ہود - ۱۰)

اور اے پیغمبر! گذشتہ انبیاء کے جتنے قصے ہم تم سے
بیان کرتے ہیں ان کے ذریعہ ہم تمہارے دل کو ثبات
اور مضبوطی بخشتے ہیں۔

دیکھو حق پر مضبوطی سے جمے رہنے کے لیے پیغمبر کو بھی تائید الہی کی ضرورت پڑتی ہے۔ پھر یہی وہ
توفیق الہی تھی جس نے صحابہ کرام کی ایک مٹھی بھر جماعت کو اپنے سے لگنے دشمنوں کے مقابلہ میں فتح مند کیا
اور فتح کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنے انعامات گنا تے وقت مسلمانوں کو یاد دلایا کہ:

اِذْ يُوحِي سَبَّكَ اِلَى الْمَلَائِكَةِ
اِنِّي مَعَكُمْ فَتَبَتُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا

یاد کرو اس وقت کو جب تمہارا پروردگار دم دے کے
یہ نازل ہوئے (و اے) ملائکہ پر وحی کر رہا تھا کہ میں تمہارا
ساتھ ہوں پس مومنوں کو ثابت قدم رکھو۔

(انفال - ۲)

نہ صرف دنیا کی زندگی میں بلکہ آخرت میں بھی یہ توفیق مومنوں کے شامل حال رہے گی،

جیسا کہ آیت زیر بحث میں تفسیر ہے اور حدیث (مشہور حدیث تجلی) میں بھی آتا ہے کہ "وہو سیماہم ویتہم" (یعنی اللہ تعالیٰ مسند عدالت پر بیٹھا ہوا ان مومنوں سے سوالات کرے گا اور ساتھ ہی ان میں قوت اور ثبات بھی بخشتا جائیگا)۔ اور حقیقت مرنے کے بعد ہی کا وقت ایسا ہوگا جبکہ انسان کو اس چیز کی سب سے زیادہ ضرورت ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ اس آیت کا شان نزول ہی عذابِ قبر فرمایا گیا ہے۔ جیسا کہ صحیح مسلم میں بروایت برادر بن عازب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے کہ:

”جب مومن قبر میں دفن کر دیا جاتا ہے تو ایک آنے والا اس کے پاس آتا ہے اور اس سے پوچھتا ہے کہ تیرا رب کون ہے؟ تیرا دین کیا ہے؟ تیرا پیغمبر کون ہے؟ وہ جواب دیتا ہے کہ میرا رب اللہ ہے، میرا دین اسلام ہے اور میرے پیغمبر محمد صلعم ہیں۔ یہ سن کر وہ اسے زور سے بھنجھوڑتا ہے اور پھر پوچھتا ہے کہ بتا تیرا رب کون ہے؟ تیرا دین کیا ہے؟ اور یہ آخری آزمائش ہے جس سے مومن دوچار ہوتا ہے اور یہی وہ وقت ہے جبکہ متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ **يُنَبِّئُ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْجَمُوعِ الدُّنْيَا وَفِي الْآخِرَةِ** الخ۔ چنانچہ بندہ پھر جواب دیتا ہے کہ میرا رب اللہ ہے، میرا دین اسلام ہے اور میرے رسول محمد صلعم ہیں۔ فرشتہ یہ سن کر کہتا ہے کہ صدقت (تو نے سچ کہا)“

صحاح کے اندر تھوڑی سی کمی بیشی کے ساتھ یہ حدیث متعدد طرق سے مروی ہے بعض میں ہے کہ آنے والا فرشتہ ایک نہیں بلکہ دو ہونگے اور مردہ کو زندہ کر کے یہ سوالات کریں گے۔ اسی طرح دوسری روایتوں میں اسی قبیل کی بعض اور تفصیلات بھی ہیں۔

وَالْقَوْلِ الثَّابِتِ“ سے مراد قولِ حق اور کلمہ صدق ہے، یعنی قولِ باطل اور کلمہ کذب کا ضد۔

کیونکہ قول کی دو ہی قسمیں ہیں۔ ایک قول وہ ہوتا ہے جس کے اندر کوئی حقیقت ہوتی ہے۔ دوسرا

وہ جو حقیقت سے عاری ہوتا ہے۔ حقیقت رکھنے والے قول کو قول ثابت کہا گیا ہے، اور قول اثبت (یعنی ثابت ترین قول) کلمہ توحید ہے کیونکہ یہی وہ سراپا حقیقت قول ہے جس کے ذریعہ اللہ اپنے بندوں کو دنیا و آخرت کی بہر زندگی میں ثبات اور قوت بخشتا ہے۔ اس قول کے اندر اتنی قوت ہوتی ہے کہ انسان جب اس کی کنہ تک پہنچ جاتا ہے تو ساری ماوی قوتیں اس کے سامنے ہیچ ہو کر رہ جاتی ہیں۔ چنانچہ تم دیکھتے ہو کہ نہ سچے آدمی سے بڑھ کر دنیا میں کوئی جبری شجاع اور قوی القلب ہوتا ہے نہ جھوٹے سے بڑھ کر کوئی ذلیل بزدل اور بے حیمت۔

(۲۲) خدا کے حضور دنیوی تعلقات کی بے اثری کی مثالیں :

کافروں کے لیے اللہ تعالیٰ زوجہ نوح اور زوجہ لوط کی مثال دیتا ہے کہ یہ دونوں عورتیں ہمارے بندوں میں سے دو صالح بندوں کے نکاح میں تھیں لیکن انھوں نے (ان کی پیروی کرنے کے بجائے) ان سے غداری کی اور ان کخلاف خدا کے نافرمانوں اور گمراہوں سے ملی رہیں، اس لیے ان کے شوہر اپنی پیغمبرانہ برگزیدگی کے باوجود اللہ کے مقابلہ میں ان کچھ کام نہ آئے اور ان کہا گیا کہ اور دوزخیوں کے ساتھ تم بھی دوزخ میں جا داخل ہو۔

اور اللہ تعالیٰ مومنوں کے لیے زوجہ فرعون کی مثال بیان کرتا ہے جب کہ اس نے کہا اے میرے پروردگار! میرے لیے اپنے باپ بہشت میں ایک گھر بنا اور

ضَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا لِلَّذِينَ كَفَرُوا
أَهْلَ نُوحٍ وَآهْلَ لُوطٍ كَانَتَا تَحْتَ عَبْدٍ
مِّنْ عِبَادِنَا صَالِحِينَ فَحَاتَمَهُمَا فَلَمْ يُغْنِيَا
عَنْهُمَا مِنَ اللَّهِ شَيْئًا وَقِيلَ ادْخُلَا
النَّارَ مَعَ الْآخِلِينَ -

وَضَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا لِلَّذِينَ آمَنُوا
أَهْلَ فِرْعَوْنَ إِذْ قَالَتْ سَبَّ ابْنُ لِي
عِنْدَكَ بِنَاتِي الْبُنْتَةُ وَنَجَّيْتَنِي مِنَ فِرْعَوْنَ
وَعَمَلِي وَنَجَّيْتَنِي مِنَ الْقَوْمِ الظَّالِمِينَ وَفِرْعَوْنُ
ابْنَةُ عِمْرَانَ الَّتِي أَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا
فِيهِ مِنْكُمْ وَحِوَاوَصَدَّقَتْ بِكَلِمَاتِ رَبِّهَا
وَكُتِبَ لَهَا مِنَ الْقَانِينِ - (تحریم ۲)

مجھے فرعون اور اس کے (برے) اعمال (کی لعنتوں) سے نجات دے اور مجھے بچاؤ ظالم سے۔ نیز دوسری مثال اللہ تعالیٰ (عمران کی بیٹی مریم کی دیتا ہے۔ جو پاکباز اور عقیقہ تھی۔ پھر ہم نے اپنی روح اس میں پھونکی۔ اور اس نے ہمارے کلمات اور ہماری کتابوں کی تصدیق کی۔ نیز وہ ہمارے فرمانبردار یا ادب بندوں میں تھی۔

ان آیات میں تین مثالیں بیان کی گئی ہیں۔ ایک کافروں کے لیے اور دوسلمانوں کے لیے۔ پہلی مثال میں یہ حقیقت واضح کی گئی ہے کہ خدا اور اس کے رسول کی نافرمانی کی پاداش آدمی کو بہر حال ملے گی خواہ اس کا رشتہ کیسے ہی برگزیدہ و مقدس لوگوں سے ہو۔ بزرگوں کے ساتھ اس کے جو سببی و مہربانی غیر دنیوی رشتے بھی ہوں ان میں کوئی اسے نہ بچا سکے گا۔ کیونکہ یہ تمام رشتے قیامت کے دن کٹ چکے ہونگے۔ اگر کوئی رشتہ اس دن کام آسکتا ہے تو وہ وہ رشتہ ہے جسے خدا کے فرستادوں نے خدا اور بندوں کے درمیان قائم کیا ہے۔ ورنہ اگر یہ رسمی، نسبی اور ازدواجی تعلقات منکرین خدا کے حق میں کچھ بھی منفعت بخش ہو سکتے تو نوح اور لوط علیہما السلام کے رشتہ ہائے ازدواجی ان کی بیویوں کے حق میں ضرور مفید ثابت ہوتے جو اگرچہ زمرہ کفار میں تھیں لیکن ان کے شوہر وقت کے سب سے بڑے باخدا انسان تھے۔ مگر ہوا یہ کہ اتنے قریبی رشتے بھی ان کافر عورتوں کے کچھ کام نہ آئے اور وہ بھی تمام کفر کشیوں کی معیت میں، بالکل انہیں کی طرح مستحق جہنم قرار دے دی گئیں۔

یہ آیت ان تمام لوگوں کی جھوٹی امیدوں کی جڑ کاٹ دیتی ہے جو خود تو دن رات معصیت الہی میں ڈوبے رہتے ہیں لیکن توقع رکھتے ہیں کہ فلاں مرد صالح کا دامن اتصال ہمیں اپنے اندر چھپانے کا اور ہم اخروی سزاؤں سے بچ جائیں گے۔ فرض کر لو کہ ایسی بے بنیاد توقعات رکھنے والے کا تعلق اس شخص سے بہت ہی قوی ہے جس کے طفیل یہ رند خراباتی اپنے کو حنیت کا وارث سمجھ بیٹھا ہے، لیکن کیا کوئی تعلق، زوجیت اور ابوت و ابنیت کے تعلقات سے بھی زیادہ گہرا زبردست ہو سکتا ہے؟

پھر اگر حضرت نوح اپنے چہیتے بیٹے کو، حضرت ابراہیم اپنے باپ کو اور حضرت نوح و لوط علیہما السلام اپنی بیویوں کو خدا کی پکڑ سے نہ بچا سکے تو تابعدار گراں چہ رسد۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں قانون مجازت کے اس اصل الاصول کو کئی جگہ بیان فرمایا ہے سورہ متحنہ میں ہے:

”تمہاری رشتہ داریاں اور تمہاری اولاد میں قیامت کے روز کچھ کام نہ آئیں گی اللہ تعالیٰ ہی،

تمہارے درمیان (باکھل ٹھیک ٹھیک) فیصلہ کرے گا۔“

دوسری جگہ ہے:

”قیامت کا دن وہ دن ہے جب کوئی کسی کو کچھ بھی فائدہ نہ پہنچا سکے گا۔ اور سارا معاملہ

اس دن اللہ ہی کے اختیار میں ہوگا (سورہ انفطار-۱)

ایک مقام پر اور آتا ہے کہ:

”لوگو! اپنے پروردگار سے ڈرو اور خوف کھاؤ اس دن کا جب نہ کوئی باپ اپنے بیٹے کے کام

آئیگا۔ اور نہ کوئی بیٹا اپنے باپ کے“ (نعمان-۴)

یہ تمام آیات مشرکین کی ان ساری باطل تمناؤں کو جھٹلا رہی ہیں جو محض کسی کے ”طفیل“ جنات

کی آس لگائے بیٹھے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ بزرگوں کی شفاعت خدا کے روبرو ہمیں ہر سزا سے محفوظ کر دے گی

یہ سب بڑی گمراہی ہے جو کوئی انسان اختیار کر سکتا ہے اور اسی کی بیخ کنی کے لیے سارے انبیاء اور

صحف سماوی کا نزول ہوتا رہا ہے۔

یہ مثال تو کفار کی عبرت پذیری کے لیے تھی۔ اس کے بعد روئے خطاب مسلمانوں کی طرف

پھرتا ہے اور دو مثالیں ان کے سامنے پیش کی جاتی ہیں۔ پہلی مثال میں انہیں بتایا جاتا ہے کہ آخرت

میں جس طرح کسی نبی یا ولی کا رشتہ کسی بدکردار شخص کو کیفر کردار تک پہنچنے سے بچا نہیں سکتا، اسی طرح

کسی نیکو کار شخص کو کسی منکر حق کی قرابت داری بھی ہرگز ہرگز موجب عزر نہیں ہو سکتی جبکہ وہ اس کی مصیبت

پرستی اور اسکے کفر و انکار سے کوئی تعلق نہ رکھتا ہو۔ فرعون سے بڑا دشمن حق شاید ہی پیدا ہوا ہو، لیکن ایسے بڑے کافر کی بیوی بھی جب اللہ کی فرمانبردار بن گئی تو اس کا فرعون کی زوجیت میں ہونا اسکی نجات کی راہ میں بالکل حائل نہ ہوا۔ یہاں ہر شخص اپنے اعمال کا خود ذمہ دار ہے۔ پیغمبر کی بیوی اگر بد عمل ہے تو پیغمبر کے رشتہ از دواج میں ہونا اسکے لیے کچھ مفید نہیں۔ اور فرعون کی بیوی اگر نیکو کار ہے تو اتنے بڑے کافر و ظالم کے ساتھ رشتہ از دواج میں وابستہ ہونا بھی اسکے لیے کچھ نقصان دہ نہیں۔ مومنوں کے ساتھ کفار کے رجمی رشتے مومنوں کی حیات اخروی کے لیے تو کسی گزند کے باعث نہیں ہو سکتے البتہ یہ ممکن ہے کہ دنیا کی زندگی میں انہیں کوئی نقصان پہنچ جائے اور جب اہل کفر پر خدا کا عذاب نازل ہو تو اس کی لپیٹ میں یہ صاحب ایمان بندے بھی آجائیں۔ اس لیے کہ خدا کی سنت ہی ہے کہ جب بچھیت مجموعی اس کی اطاعت سے بغاوت ہونے لگتی ہے اور عتاب الہی نمودار ہوتا ہے تو اس وقت عذاب کی وسعت محض کفار اور معاندین حق ہی تک محدود نہیں رہتی بلکہ ان کے ساتھ رہنے والے جو دو چار صالح بندے ہوتے ہیں وہ بھی اس کی زد میں آجاتے ہیں۔

دوسری مثال میں اسی حقیقت کو ایک تیسرے پہلو سے نمایاں کیا گیا ہے۔ پہلی مثال میں جس عورت کے انجام کو پیش کیا گیا تھا وہ ایسی عورت تھی جس کا تعلق ایک مرد صالح سے تھا۔ دوسری مثال میں جس عورت کا ذکر کیا گیا اس کا رشتہ ایک کافر و فاسق شخص سے تھا۔ اب تیسری عورت (حضرت مریم) کی مثال دی جاتی ہے جو مذکورہ بالا دونوں رشتوں میں سے کوئی رشتہ نہیں رکھتی تھیں ان تینوں اقسام کی عورتوں کے حالات و عواقب بیان کرنے میں دراصل ایک ہی مقصد پوشیدہ اور ایک ہی اصول جزا کا اظہار مطلوب ہے، یعنی یہ کہ ہر شخص اپنی شخصی ذمہ داری پر نجات یا عذاب کا سزاوار بنتا ہے۔ نہ کسی نیک آدمی کا رشتہ اسے آخرت کی سزاؤں سے بچا سکتا ہے جیسا کہ پہلی مثال میں مذکور ہے، نہ کسی بدکار کا رشتہ ماؤی کسی کی نجات اخروی میں حائل ہو سکتا ہے جیسا کہ دوسری

مثال تبار ہی ہے، اور نہ کسی شخص کی جزا و سزا پر اس کا کوئی رشتہ نہ رکھنا اثر انداز ہو سکتا ہے جیسا کہ تیسری مثال حضرت مریم کی سرگذشت (شہادت دے رہی ہے)۔

سورہ کے سیاق پر نظر ڈالنے سے ان امثال کے بعض نکات اور سامنے آتے ہیں۔ پہلے سے ازدواج مطہرات کا ذکر چلا آ رہا ہے اور انہیں اپنی شخصی ذمہ داریاں یاد دلائی جا رہی ہیں۔ پھر اس سلسلے میں انہیں کے مثل دوسری عورتوں کے حالات پیش کر کے انہیں متنبہ کیا جا رہا ہے کہ اگر تم نے اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کی تو یاد رکھو رسول اللہ صلعم سے تمہارا امتساب آخرت میں کچھ کام نہ آئیگا جیسا کہ لوط اور نوح علیہما السلام کی ازواج کا معاملہ تمہارے سامنے ہے۔ چنانچہ اسی مناسبت سے ان امثال میں عام قرابت داریوں کا ذکر نہیں ہے بلکہ خاص نکاحی رشتوں ہی کا ذکر کیا گیا ہے۔

یحییٰ بن سلام کہتے ہیں کہ پہلی مثال حضرت عائشہؓ اور حضرت حفصہؓ کی تنبیہ اور تخذیر کے لیے بیان کی گئی ہے۔ پھر دوسری مثال کے ذریعہ انہیں سمع و طاعت پر ابھارا گیا ہے۔ تیسری مثال میں بھی جو حضرت مریم سے متعلق ہے اور مومنوں کے لیے بیان کی گئی ہے، ایک اور نکتہ مضمون ہے۔

یعنی یہ کہ حضرت مریم پر یہودی اشرار نے جو جھوٹی، اہمیتیں تراشی تھیں انہوں نے اللہ کے نزدیک حضرت مریم کو کوئی ضرر نہیں پہنچایا بلکہ وہ اس کے ہاں ویسی ہی برگزیدہ رہیں جیسا کہ واقعہ وہ تھیں اور انہیں اللہ تعالیٰ نے تمام صنف نازک پر فضیلت بخش کر صدیقہ کا مرتبہ جلیلہ عطا فرمایا۔ پس اس مثال سے معلوم ہوا کہ فاسق و فاجر لوگوں کا کسی نیکو کار کو متہم کرنا خدا کے نزدیک کوئی وقعت نہیں رکھتا۔ اس پہلو سے گویا یہ مثال حضرت عائشہؓ صدیقہ کے لیے موجب تسکین و تسلی بھی ہے، اگر یہ سورہ واقعہ انک کے بعد نازل ہوئی ہو، جیسا کہ صحیح روایات سے ثابت ہوتا ہے۔